بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِشارات

اگر آپ کو کبھی لاہور میں انارکلی یا اُس کے قرب و جوار سے گزرنے کا اتفاق ہُوا ہو تو آپ کی نگاہوں کے سامنے وہ سادہ سا دیہاتی ضرور گزرا ہو گا جو ایک سائیکل پر سوار ہو کر بڑے ہی پُرسوز انداز میں لوگوں کو دوزخ کے عذاب سے ڈراتا ہے۔ شور و شغب کے اُس ماحول میں جب کہ ہر شخص کاروبار کی گہما گہمیوں میں پوری طرح گم ہوتا ہے، اُس کی ترغیب و ترہیب بڑی عجیب و غریب دکھائی دیتی ہے۔ کچھ لوگ اس کا نوٹس لینا ہی اپنی شان سے فروتر سمجھتے ہیں، کچھ اُس کی سادگی پر پھبتیاں کستے ہوئے قریب سے گزر جاتے ہیں، کچھ قیامت کا تذکرہ سُن کر چند طنزیہ فقرے چست کر کے اُس کی طرف سے مُنہ موڑ لیتے ہیں۔ مگر وہ شخص اپنی بات پوری یکسوئی اور دردمندی کے ساتھ، دیکھنے والے اور سننے والوں کے طرزِ عمل سے بالکل بے پروا ہو کر کہے جاتا ہے۔ وہ کسی سے کچھ مانگتا نہیں، کسی کی طرف للچائی ہوئی آنکھوں سے نہیں دیکھتا۔ بس لوگوں کو آخرت اور اُس کے انجام سے ڈراتا ہے۔

اس شخص کا طرزِ تبلیغ کس حد تک نتیجہ خیز ہے، اس چیز سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔ لیکن اُسے دیکھ کر ایک محدود پیمانہ پر ہی سہی انسان کے سامنے وہ منظر ضرور آجاتا ہے جو دنیا کی لذتوں میں کھوئی ہوئی مخلوق داعیانِ حق کے مقابلے میں پیش کرتی ہے۔ یُوں نظر آتا ہے کہ پوری دنیا ایک انارکلی ہے جس میں ہر فرد دنیا کی فوائد و لذائذ کے حصول کے لیے دیوانہ وار بھاگا جا رہا ہے۔ اُسے کام و دہن کی لذت کے علاوہ کوئی فکر نہیں، اچھے سے اچھے لباس اور بہتر سے بہتر سامانِ آرائش حاصل کرنے کے علاوہ اُس کا کوئی دوسرا مقصد نہیں۔ مال فروخت کرنے والے ہیں کہ حلال و حرام کے تکلف، احساسات سے قریب تر

عاری ہو کر دولت سمیٹنے میں مصروف ہیں۔ وہ انسان نہیں بلکہ مشینیں ہیں جو صبح سے شام تک بے جان سکے جمع کرنے میں مصروفِ عمل رہتی ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ یہ دیکھیں کہ وہ جو مال لوگوں کو دے رہے ہیں اُس سے قوم کے اخلاق اور سیرت و کردار پر کیا اثر پڑے گا۔ انہیں بس ایک ہی دُھن لگی ہوئی ہے کہ کسی طرح اُن کی تجوریاں جلد از جلد بھری جا سکیں۔

انارکلی کا جو منظر اوپر پیش کیا گیا ہے یہ کسی ایک مقام یا کسی خاص جگہ کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ مادی تہذیب کا شارح اور ترجمان ہے۔ یہ خدا سے غافل لوگوں کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ یہ مادہ پرستانہ ماحول کا ایک زندہ نمونہ ہے جس میں خدا کی طرف بلانے والوں اور عذابِ قیامت سے ڈرانے والوں کی آواز کو ہمیشہ وحشت اور دیوانگی کی آواز سمجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس روحانیت کُش اور اخلاق سوز ماحول میں مادی لذات میں ڈوبے ہوئے انسانوں نے دعوت الی اللہ کے معاملے میں ہمیشہ اسی بے رخی اور عدم توجہی کا مظاہرہ کیا جو آج انارکلی کے اندر بیچارے غریب "دیہاتی" کی نحیف مگر دل ہلا دینے والی آواز کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ تاریخ کے ہر عہد میں جب بھی مادی تہذیب کا غلغلہ بلند ہوا تو خدا خوفی، تقویٰ، پرہیزگاری، حشر و نشر اور آخرت کی جواب دہی کی باتیں کرنے والوں نے معاشرے میں اپنے آپ کو اتنا ہی اجنبی اور بے بس پایا جتنا کہ یہ اللہ کا بندہ اپنے آپ کو پا رہا ہے۔ یہ بیچارا تو ایک عام دردمند مسلمان ہے۔ ممکن ہے وہ حکمتِ تبلیغ کی نزاکتوں سے بھی واقف نہ ہو اس لیے ابلاغِ حق میں اُس سے کوتاہی ہو سکتی ہے۔ مادی تہذیب کے پرستاروں کے قلب و دماغ میں تو اُن پاکباز لوگوں کی آواز بھی اثر و نفوذ نہ کر سکی جنہیں اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اپنی نگرانی میں اس مقدس فرض کی انجام دہی کے لیے تربیت دی تھی۔ غفلت میں ڈوبے ہوئے ان دنیا داروں نے نہ صرف اُن کی دعوت سے اعراض برتا بلکہ خدا کے فرستادوں کا مذاق اڑایا، ان کی راہ میں روڑے اٹکائے، ان کی سرِ بازار تضحیک کی، ان کے خلاف طرح طرح کے الزامات تراشے، انہیں مختلف قسم کی اذیتیں پہنچائیں حتیٰ کہ ان کی مقدس اور پاکیزہ زندگیوں کے چراغ کو گُل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ ان دنیا پرستوں کے افکار و نظریات اور حق کے معاملے میں اُن کی بے حسی اور سرد مہری بلکہ دشمنی اور بغاوت کے تذکرے ملتے ہیں۔ جب حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کی بندگی اختیار کرنے اور نیکی اور پرہیزگاری کی راہ پر چلنے کی دعوت دی تو اس بدنصیب قوم نے جس شرمناک طریق سے اس دعوت کو جھٹلایا وہ دنیا داروں کے نفسیات کی نہایت ہی صحیح عکاسی کرتا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۔ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ (الاعراف - ۸)	ہم نے نُوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ مَیں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا، ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت اور قوم کے سربراہوں کا اس دعوت سے اعراض حق و باطل کی آویزش کی نہایت اچھے انداز سے ترجمانی کرتا ہے اور اس سے دونوں کی مخصوص نفسیات کا بآسانی تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک طرف اخلاص اور صداقت ہے اور دوسری طرف غرور و استکبار۔ ایک طرف بے لوثی اور درد مندی ہے اور دوسری طرف مفادات کی پرستش اور نخوت۔ ایک طرف کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کو تسلیم کرنے کی مخلصانہ پیش کش ہے اور دوسری طرف اس بنیادی حقیقت، جو سورج سے بھی زیادہ روشن ہے، کو رد کرنے کے مختلف ڈھکوسلے۔ ایک طرف ایمان اور یقین کا پہاڑ ہے اور دوسری طرف مکر و فریب کا بیتِ عنکبوت۔

پھر اس آیت میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اس قوم کو اخلاقی برائیوں نے بالکل کھوکھلا کر دیا تھا۔ وہ انحطاط کی اُس منزل پر پہنچ چکی تھی جس میں لوگ اپنی کج فہمی کی بنا پر باطل کو حق

اور حق کو باطل سمجھنے لگتے ہیں اور حق و صداقت کے داعیوں کو تعصب، تنگ نظری اور رجعت پسندی کا علمبردار قرار دیتے ہیں۔

فکر و نظر کا یہ انقلاب اور احساس و جذبات کی یہ تبدیلی دفعتاً واقع نہیں ہوتی بلکہ آہستہ آہستہ دبے پاؤں یہ سارے مراحل طے کیے جاتے ہیں۔ جب کوئی قوم حق کی سیدھی راہ چھوڑ کر گمراہی کی طرف بڑھتی ہے تو اس کے راستے کی پہلی منزل یہ ہوتی ہے کہ عوام کے دلوں میں نیک کام کرنے کی لگن اور برائی سے بچنے کی تڑپ ختم ہوتی ہے۔ پھر خیر و شر کے درمیان فطرت نے جو وسیع خلیج حائل کر رکھی ہے وہ آہستہ آہستہ پاٹتی ہے اور بالآخر نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ لوگ منکرات کو گوارا کرنے لگتے ہیں

کسی فرد یا گروہ کا برائی کو برداشت کر لینا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کے دل میں نیکی سے محبت اور اس کے تسلط کے لیے عزم ختم ہو رہا ہے اور اس کے مقابلے میں برائی کے خلاف اس کے قلب و دماغ میں جو نفرت فی الواقع ہونی چاہیے وہ بھی آہستہ آہستہ مٹتی جا رہی ہے۔ اسی وجہ سے خیر و شر کے اس زبردست ہنگامہ سے منہ موڑ کر وہ کسی گوشۂ عافیت میں پڑا اپنی زندگی کے ایام گزار رہا ہے۔ جس طرزِ عمل کو ایک انسان واقعی اپنے لیے، اپنے خاندان کے لیے، اپنی قوم کے لیے اور پوری نوعِ بشری کے لیے صحیح اور برحق سمجھتا ہے اور جس میں وہ دنیوی اور اخروی فلاح کا راز مضمر پاتا ہے اس کے بارے میں وہ کبھی بھی سرد مہری کا رویہ اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ اس طرزِ عمل کو سب سے پہلے پوری یکسوئی کے ساتھ خود اپنانے کی کوشش کرے گا، پھر اسے دوسروں کو اختیار کرنے کی بڑے اخلاص اور دردمندی کے ساتھ دعوت دیگا۔ اس کے راستے میں جو موانع ہیں انہیں ہٹانے کی فکر کرے گا۔ اس کے دل میں اس طرزِ عمل کے ساتھ جتنی زیادہ وابستگی ہوگی اسی نسبت سے اسے پھیلانے، اس کی برتری قائم کرنے کے لیے اس کے اندر تڑپ بھی موجود رہے گی

اسی طرح اس کا دل جس قول یا فعل کو فی الواقع منکر سمجھتا ہے اور جس کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے میں وہ اپنی اور نوعِ انسانی کی بربادی دیکھتا ہے، اس کی ترقی کو وہ کبھی غیر متعلق تماشائی بن کر برداشت

نہیں کر سکتا۔ وہ اسے جتنی خطرناک برائی سمجھے گا اتنی ہی اُس کے دل میں اس کے خلاف عداوت اور نفرت ہو گی اور وہ اسے مٹانے کے لیے جدوجہد کرے گا۔

خیر و شر کی اس کشمکش میں جتنا کوئی شخص یا گروہ بے تعلق اور غیر جانبدار ہوتا ہے اُسی تناسب سے اُس کے اندر ایمان کی حرارت کم ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک دن ایسا آتا ہے کہ وہ محض ایک راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے جسے فسق و فجور کی آندھیاں اور باطل کے جھکڑ جس طرف چاہتے ہیں اڑا کر لے جاتے ہیں۔ ایمان کا جو شعلہ منکرات کے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کا عزم اور ہمت نہیں رکھتا وہ کبھی دیر تک اپنی روشنی قائم نہیں رکھ سکتا۔

یہ صورتِ حال جس میں لوگ فسق و فجور کو عین اپنی آنکھوں کے سامنے بڑھتے ہوئے دیکھیں لیکن ان کے اندر کوئی جھنجلاہٹ نہ پیدا ہو اور وہ اس کی سنگینی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی نیندیں حرام کرنے سے گریز کریں، [illegible] کے سیلاب کو روکنے کے لیے اپنے مفادات کو قربان کرنے پر اپنے آپ کو تیار نہ پائیں، کسی قوم کے لیے کوئی خوش کن بات نہیں۔ یہ ایک روگ ہے جو اُسے اندر ہی اندر کھا جاتا ہے۔ لیکن یہ مرض کی آخری منزل نہیں ہوتی۔ اس منزل میں لوگ بھلے اور بُرے کے درمیان تمیز کر سکتے ہیں۔ وہ اگرچہ نیکی کو قائم کرنے اور برائی کو مٹانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ تو نہیں ہوتے لیکن اُن کے دل و دماغ نیکی کو بہر حال نیکی ہی سمجھتے ہیں اور برائی کو بُرائی کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔

اگر انحطاط کا یہ سلسلہ جاری رہے اور اصلاحِ حال کی کوشش نہ کی جائے تو پھر یہ مرض شدید صورت اختیار کر لیتا ہے اور قوم اسی منزل پر پہنچ جاتی ہے جس پر کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پہنچ چکی تھی۔ یہ منزل نہیں ہوتی بلکہ کسی قوم کی تباہی و بربادی کا پیغام ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ مرض اس کے رگ و پے میں پوری طرح سرایت کر چکا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ اور اس کے قلب و دماغ کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہا جس میں اس کی جڑیں اچھی طرح نہ [illegible]

چکی ہوں۔

یہ وہ منزل ہے جس میں اخلاقی اور روحانی عوارض اُس کی زندگی کا جزو بن کر اُس کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو، اُس کے ضمیر و وجدان کو اور اُس کے احساسات و جذبات کو یکسر بدل دیتے ہیں۔ قلب و دماغ کی اس تبدیلی کے بعد اُس کی زندگی کی ساری قدریں زیر و زبر ہو جاتی ہیں۔ برائی بھلائی کا روپ دھار لیتی ہے۔ منکر معروف کا جامہ پہن کر معاشرے میں سرگرم عمل ہوتا ہے۔ نیکی اور شرافت کی جگہ چالاکی اور عیاری کی عزت و تکریم ہونے لگتی ہے۔ جزا و سزا، اور حشر و نشر کو لوگ محض اعتباری باتیں سمجھ کر نظر انداز کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ خدا خوفی اور فکرِ آخرت کو تنگ نظر اور تاریک خیال لوگوں کا بیکار مشغلہ قرار دے کر، اُسے بے وقعت بنایا جاتا ہے۔ کسی قادرِ مطلق ذات پر ایمان اور یقین اور اُس کے نازل کردہ احکام کی اتباع اور پیروی کو کم علموں کا شیوہ گردان کر لوگوں کو اسے ترک کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

قلب و نگاہ کی اس تبدیلی کے نتیجے میں معاشرے کے سارے ڈھانچے میں ردّ و بدل ہو جاتا ہے۔ سوسائٹی میں وہ لوگ جو فی الحقیقت پہاڑی کا چراغ اور زمین کا نمک ہوتے ہیں، وہ بے وزن ہو کر رہ جاتے ہیں اور قیادت اور سیادت کا منصب اُن لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتا ہے جن کے اخلاق کا بالکل دیوالیہ نکل چکا ہو۔ وہ ہر عمل کو مادی نفع و نقصان کی کسوٹی پر پرکھ کر اُس کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک نیکی اور بھلائی کے ..... یہ معنی ہوتے ہیں کہ کسی طرح زر و مال کی زیادہ سے زیادہ مقدار ملیر آسکے، معاشرے میں ان کی کبریائی کے ٹھاٹھ قائم ہوں۔ اُن کی زبان جس چیز کو حق کہہ دے اُسے معاشرہ حق کی حیثیت سے ہی بلا چون و چرا تسلیم کرے اور جس چیز کے خلاف اُن کی بارگاہ سے باطل کا فتویٰ صادر ہو جائے اُسے بادنیٰ تامل باطل قرار دے دیا جائے۔ ان گمراہ کن لوگوں کی فطرت اس حد تک مسخ ہو جاتی ہے

اور ان کی جسارت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی پاکیزہ اور مقدس تعلیم میں کیڑے نکالنے شروع کر دیتے ہیں اور انہیں خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ اُس کے اپنانے سے اُن کی قوم کو نقصان پہنچے گا۔

ان لوگوں کو اپنی عقلی برتری کا بڑا دعویٰ ہوتا ہے اور وہ سارے معاملات کی قدر و قیمت کا اندازہ بزعمِ خود عقل کی میزان پر تول کر کرتے ہیں۔ لیکن وہ عقل جو اپنی حدود سے پوری طرح واقف نہ ہو اور جسے وحی اور الہام کے مقابلے میں اپنے مزعومات پر زیادہ اعتماد ہونے لگے اس عقل پر اگر اللہ کی پھٹکار نہیں پڑتی تو اور کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ عقل کے ان اندھوں کو کوئی چیز بھی صحیح نظر نہیں آتی۔ معاشرے کے وہ لوگ جن کے دم قدم سے خیر اور بھلائی کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور شرافت کی اقدار دنیا میں پھلتی پھولتی ہیں وہ انہیں بیوقوف اور رذیل دکھائی دیتے ہیں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ أَن لَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ أَلِيمٍ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ۔

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (تھا۔ اس نے کہا) میں تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک دردناک عذاب آئے گا۔ جواب میں اُس کی قوم کے سردار جنہوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا۔ بولے ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے جو لوگ کمین اور چھچھورے تھے ان کے سوا کسی نے بلا تامل تمہاری پیروی نہیں کی۔ ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے بڑھے ہوئے ہو بلکہ ہم تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔

جن لوگوں کی بدنصیبی اور کوتاہ بینی کا یہ عالم ہو کہ وہ معرفتِ الٰہی کے بیش بہا خزانے حاصل کرنے والوں کو تہی دامن قرار دیں اور انہیں کمینے اور چھچھورے کے نازیبا الفاظ سے مخاطب کریں، جنہیں فہم و فراست کے بلند بانگ دعووں کے باوجود خدا کے ان پاکباز بندوں کی اخلاقی اور روحانی برتری اور اُن کے اعلیٰ اور ارفع سیرت و کردار اور اپنی کم فہمی اور اخلاقی دیوالیہ پن کے درمیان کوئی امتیاز نظر نہ آتا ہو، اُن کی طرف اگر انسانیت رشد و ہدایت کے لیے لپکے تو اُسے سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

اگر آپ خدا اور رسول کے ان دشمنوں کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی مخالفت کی اصل وجہ یہ نہیں ہوتی کہ کائنات کی وہ بنیادی حقیقتیں جنہیں تسلیم کرنے کی انبیاء علیہم السلام دعوت دیتے ہیں وہ ان کے ذہن نشین نہیں ہو سکتیں بلکہ ان کی مخاصمت کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ قیادت اور سیادت کا وہ منصب جو بُری بھلائی اور عیاری سے اُن کے ہاتھ آتا ہے اس دعوت کے پھیلنے سے اُس کے چھن جانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ انہیں ہر لمحہ یہ خوف محسوس ہوتا ہے کہ آفتابِ ہدایت کے طلوع ہو جانے کے بعد باطل کی تاریکیاں خود بخود چھٹ جائیں گی اور اندھیروں میں معاشرے کے اندر وہ جس قسم کی دراز دستیاں کرتے رہے ہیں اُن سب کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کے ان خدشات کو کئی موقعوں پر نقل کیا ہے۔ سورۂ "المومنون" میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے سلسلے میں اُن کے اسی خدشہ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ	ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا
يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ	اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اس کے
اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۔ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	سوا تمہارے لیے کوئی معبود نہیں ہے۔ کیا تم ڈرتے
مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ	نہیں ہو، اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے

اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ۔ (رکوع ۲)

سے انکار کیا وہ کہنے لگے کہ یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی مخالفت کا اصل محرک یہ نہیں کہ انبیاء علیہم السلام اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر یہ دعوت محض نظری ہوتی اور اس کی ترقی سے اُن کی غلط قیادت پر کوئی ضرب کاری لگنے کا خطرہ نہ ہوتا، تو وہ کبھی بھی اس کی راہ میں اس طرح مزاحم نہ ہوتے جس طرح کہ وہ فی الواقع ہوتے تھے، لیکن وہ اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے تھے کہ جس رفتار سے یہ دعوت پھیل رہی ہے اسی رفتار سے معاشرے کے اندر ان کی خدائی کا طلسم ٹوٹ رہا ہے۔ خالقِ کائنات کی حاکمیت تسلیم کر لینے کے بعد کسی فرد یا گروہ کی کبریائی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ اور یہی وہ اصل خطرہ ہے جس کے پیشِ نظر جھوٹے خداؤں نے دینِ حق کا ہمیشہ راستہ روکنے کی مذموم کوششیں کیں۔

پھر اسی ضمن میں ان دنیا پرستوں کی سیرت کا یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ وہ ہر معاملہ کو جیب اور پیٹ کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اُن کی عقل کبھی یہ باور ہی نہیں کر سکتی کہ دنیا کا کوئی شخص یا گروہ بے لوث اور بے غرض بھی ہو سکتا ہے اور مادی فوائد سے بلند ہو کر کوئی مقدس فرض سرانجام دینے کی ہمت کر سکتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ "دین کی دعوت" بھی محض ایک کاروبار ہے جسے چند لوگ دنیاوی نفع کے لالچ میں چمکانا چاہتے ہیں۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام کو بار بار ان کی پھیلائی ہوئی اس غلط فہمی کو دُور کرنا پڑا اور ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانی پڑی کہ زر و مال دنیا پرستوں کے لیے تو بلاشبہ اپنے اندر غیر معمولی کشش رکھتا ہے اور اس ایک محرک کے علاوہ کوئی دوسرا محرک انہیں کسی کام کے لیے سرگرمِ عمل نہیں کر سکتا لیکن وہ لوگ جن کی نگاہیں دنیا کی اس عارضی اور خواب آسا زندگی کے بجائے آخرت کی پائیدار زندگی پر لگی ہوتی ہیں اُن کے اعمال کے محرکات مادی فوائد کے بجائے اخروی انعامات ہوتے ہیں۔ یہ مقدس لوگ اپنی خدمات کے صلے

کے لیے دنیا کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے بلکہ اپنے خالق اور مالک کی بارگاہ میں دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام نے بار بار یہی کہا کہ اُن کا اجر بس اللہ ہی کے پاس ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے باطل کے علمبرداروں کے خدشات کی تردید کرتے ہوئے بڑے بلیغانہ انداز میں فرمایا:

یٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مَالًا ۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ ۔ (ہود - ۲۹)

اے قوم! میں تم سے مال و متاع کا مطالبہ نہیں کرتا میرا اجر تو اللہ کے ہاں ہی ہے۔

جب کسی معاشرہ پر باطل کے پرستاروں کا تسلط قائم ہو جاتا ہے تو پھر پورے معاشرے کا مزاج اس طرح بگڑ جاتا ہے کہ اُس کے اندر نیک اور بھلے لوگ اجنبی بن جاتے ہیں اور ان کی جگہ شر پسند اور اخلاق باختہ لوگوں کی پذیرائی ہونے لگتی ہے۔ خدا ترس لوگ اُس معاشرے کے اندر ایک بوجھ کی حیثیت سے دیکھے جاتے اور اُن کے اثرات کو زائل کرنے کے مختلف منصوبے تیار ہوتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کے اسی احساس کو قرآن مجید نے مندرجہ ذیل الفاظ میں یوں بیان فرمایا ہے:

وَاتْلُ عَلَیْہِمْ نَبَاَ نُوْحٍ اِذْ قَالَ لِقَوْمِہٖ یٰقَوْمِ اِنْ کَانَ کَبُرَ عَلَیْکُمْ مَّقَامِیْ وَتَذْکِیْرِیْ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَعَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ ۔ (یونس - ۷۱)

اور اے پیغمبر ان کو نوح کا قصہ سناؤ۔ جب اُس نے اپنی قوم سے کہا: بھائیو اگر تم میں میرا رہنا اور خدا کی آیتیں سنانا تم کو گراں گزرتا ہے تو میں تو اپنے رب پر ہی تکیہ لگاتا ہوں۔

کسی معاشرے کی اس سے بڑی گراوٹ اور کیا ہو سکتی ہے کہ حق اور صداقت کے داعیان تو اس پر بوجھ محسوس ہوں اور باطل کے محافظ اور علمبردار اس کے نجات دہندہ خیال کیے جائیں۔

جب کوئی سوسائٹی کفر و الحاد کے دعویداروں کو فسق و فجور کی سرپرستی کرنے والوں کو نہ صرف قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے بلکہ انہیں معاشرے کے اندر عزت و احترام کا ایک بلند مقام عطا کر دے اور اُن کے مقابلے میں اُن حضرات سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے جن کے ذریعہ وہ

صحیح معنوں میں فوز و فلاح حاصل کر سکتی ہے تو پاگل پن اور دیوانگی کی اس کیفیت کے پیدا ہو جانے کے بعد پھر اُس سوسائٹی کو تباہی سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی الّا یہ کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے فضل و کرم سے اُس کے بچاؤ کے غیب سے کوئی خصوصی انتظامات فرما دے

اس آسمان کے نیچے جن قوموں اور معاشروں کے اندر بھی یہ اخلاقی اور روحانی برائیاں پروان چڑھیں انہیں حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا۔ خدا کا قانون کبھی ٹوٹنے والا نہیں، اور اُس کی سُنّت آج تک کبھی انسانوں کی کسی بھیڑ کے لیے نہیں بدلی۔ جس طرح آگ جلاتی ہے اور زہر کے کھانے سے انسان موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے بالکل اسی طرح خدا سے بغاوت اور سرکشی اور اس کے بتلائے ہوئے راستہ سے انحراف، ہلاکت لاتا ہے ۔ اس باغیانہ طرزِ عمل سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا ۔ بلکہ قوموں کو عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے، اب بھی ایسا ہی ہو رہا ہے اور جب تک قدرت کا یہ نظام قائم ہے اسی طرح ہوتا رہے گا۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۔ (۳۳-۶۲)

یہ اللہ کا قانون ہے جس کے مطابق تمام گزری ہوئی قوموں سے سلوک ہوا اور اللہ کے قانون میں تم کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

آپ قرآن مجید کے اوراق اُلٹیے تو آپ کو جگہ جگہ سرکش قوموں کی عبرتناک داستانیں بکھری ہوئی ملیں گی۔ دنیا میں بے شمار قومیں اس دھرتی کے سینہ پر اُبھریں، انہوں نے اپنے فہم و تدبر اور جوشِ عمل سے طاقت کو غلام بنایا اور پھر دنیا پر چھا گئیں لیکن جلد ہی قوت اور عظمت کے غلط احساس نے اُن کے دماغی توازن کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ پھر انہوں نے خدا کی کبریائی کی دعوت دینے کے بجائے اپنی خدائی کا سکّہ چلانا شروع کیا۔ انسانوں کے درمیان شریف و کمین کی مصنوعی تفریق پیدا کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ قوت و طاقت جس کے بل بوتے پر انہوں نے دنیا میں اپنی سیادت اور برتری قائم

کی تھی وہ اُن کی جان لیوا ثابت ہوئی اور تاریخ کے وہ اوراق جن میں اُن کے کارنامے جلی حروف سے لکھے گئے تھے ان میں اُن کی حسرتناک بربادی کے مرثیے بھی درج ہوئے۔

اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۔ (التوبہ-۹)

کیا انہوں نے ان لوگوں کا حال نہیں سنا جو اُن سے پہلے گزر چکے ہیں۔ مثلاً قوم نوح، عاد، ثمود، قوم ابراہیم، اصحاب مدین اور وہ لوگ جن کی بستیاں الٹ دی گئیں۔ ان سب کے پاس اللہ کے رسول آئے اور راہِ حق کی نشانیاں انہیں دکھائیں لیکن انہوں نے بدعملیوں کی راہ اختیار کی اور اس کی پاداش میں مٹا دیئے گئے۔ سو اللہ تو کسی پر ظلم نہیں کرتا مگر ان بدبختوں نے خود ہی اپنی ہلاکت چاہی

اسی حقیقت کی طرف سورہ ابراہیم میں یوں توجہ دلائی گئی ہے:

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۭ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ (۲)

کیا تمہیں اُن لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، قوم نوح، عاد، ثمود اور ان کے بعد میں آنے والے جنہیں سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا ہے۔ اُن کے پاس اُن کے پیغمبر نشانیاں لیکر آئے تو وہ غصے سے اپنے ہاتھ کاٹنے لگے اور کہنے لگے کہ تمہیں جس تعلیم کے ساتھ دنیا میں بھیجا گیا ہے ہم اسے نہیں مانتے اور جس چیز کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس پر ہمارے دل مطمئن نہیں ہو پاتے۔

اس سے اگلی آیت میں استعجاب اور حسرت کے ملے جلے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے انہیں مخاطب کر کے پوچھا گیا ہے۔

أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۔

کیا تمہیں ارض و سما کے خالق اللہ کے بارے میں شک ہے۔

یعنی تمہارے دماغ اتنے ماؤف ہو چکے ہیں اور تمہاری عقلوں پر اس قدر پردے پڑ چکے ہیں کہ تمہارے اندر کائنات کی معروف، مسلّم اور بیّن حقیقت کے بارے میں بھی اشتباہ پیدا ہو رہا ہے۔ خدا کا وجود خود انسان کے اپنے وجود سے زیادہ واضح حقیقت ہے۔ خالق کی نشانیاں اس کائنات کے کونے کونے میں بکھری ہوئی ہیں اور اس کا ہر ذرہ اُس کی حکمت بالغہ اور لازوال قوت و طاقت پر شہادت دے رہا ہے۔ تمہارا یہ انکار کچھ اس وجہ سے نہیں کہ تمہیں حق کو پہچاننے میں کچھ دشواریاں پیش آ رہی ہیں بلکہ اس کی اصل وجہ صرف ایک ہی ہے کہ تم نے اپنی بداعمالیوں سے اُس جوہر نایاب کو منسلخ کر دیا ہے جسے عقل سلیم اور وجدان کہا جاتا ہے۔ اب تمہاری حیثیت انسانوں کی نہیں بلکہ جانوروں کی سی ہے بلکہ بعض پہلوؤں سے تم جانوروں سے بھی بدتر ہو۔ تمہاری آنکھوں میں بصارت تو ہے لیکن وہ بصیرت سے محروم ہو چکی ہیں۔ تمہارے کانوں میں قوت سماعت تو ہے لیکن اب وہ فطرت کی ان لطیف آوازوں کو سننے سے قاصر ہے جو افلاک سے آتی ہیں۔ تمہارے دل بس گوشت کے لوتھڑے ہیں جو تمہارے پہلوؤں میں ہر وقت ہلتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کے اندر کوئی احساس پیدا نہیں ہونے پاتا۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔

ان کے پاس دل ہیں مگر سوچتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں مگر سنتے نہیں، وہ مثل چارپایوں کے ہو گئے ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر، اور یہی ہیں کہ غفلت میں ڈوب گئے ہیں۔

جب کوئی قوم غفلت کی اس نچلی سطح پر آجاتی ہے کہ اس کے نہ سوچنے، سمجھنے اور غور سے

کی ساری صلاحیتیں ختم ہو جائیں اور اس کے احساسات کے رواں دواں دھارے بالکل خشک ہو کر رہ جائیں تو پھر اُسے دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بحیثیت انسان پیدا کیا ہے لیکن جب اُس کی انسانیت جس کی وجہ سے اُسے اشرف المخلوقات کا تاج پہنایا گیا ہے وہی ختم ہو جاتی تو پھر وہ دنیا کی پشت پر ایک بوجھ بن جاتا ہے اور اس بنا پر قانونِ مکافات کے مطابق یہ سرزمین اُس کے وجود سے جلد ہی پاک کر دی جاتی ہے قرآن مجید نے بار بار اس حقیقت کی طرف غافل انسانوں کی توجہ مبذول کرائی ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَكُمْ۔ (الانعام ۔ ۱)	کیا ان لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی امتوں کو ہلاک کیا۔ ہم نے انہیں زمین میں وہ سربلندی اور سرفرازی عطا کی تھی جو تمہیں نہیں کی۔
وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِئْيًا۔ (مریم ۔ ۵)	اور ہم نے اس سے پہلے کتنی امتوں کو تباہ کر دیا جو ان سے سامانِ زیست اور نمود و نمائش میں کہیں بڑھے ہوئے تھے۔
وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (الانبیاء ۲)	اور بہت سی بستیاں جہاں کے لوگ سرکش تھے انہیں ہم نے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور ان کے بعد دوسرے لوگ پیدا کئے۔
وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا۔ (القصص ۔ ۳۰)	اور کتنی بستیاں جو اپنی معاش پر اترا رہی تھیں انہیں ہم نے ہلاک کر کے رکھ دیا اور ان کے اُجڑے ہوئے گھر پھر آباد نہیں ہوئے

آج ہم سوچیں کہ کہیں ہم بھی اپنے اعمال و افعال سے خدا کے عذاب کو انگیخت تو نہیں کر رہے۔ بغاوت اور سرکشی کی وہ کونسی سرحد ہے جس کو ہم نے پار کرنے کی جسارت نہیں کی۔ اللہ کے دین کے ساتھ ہم بالکل مذاق کرتے ہیں۔ اسے زبان کی حد تک ہدایت اور رہنمائی کا واحد سرچشمہ تسلیم

کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے شعبوں سے اسے خارج کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہماری سیاست، ہماری معیشت اور ہماری معاشرت سے اس کے اثرات کو ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت زائل کیا جا رہا ہے۔ ہم اس دین کی صداقت کے دعویدار بھی ہیں لیکن اس کے بارے میں مختلف قسم کے شکوک و شبہات بھی پھیلاتے رہتے ہیں۔ کبھی ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کو اپنانے سے ہماری ترقی رک جائے گی، ہماری معیشت تباہ ہو گی، ہماری سیاسی ساکھ برباد ہو کر رہ جائے گی۔ ہم دنیا کی نظروں میں ایک پسماندہ قوم کی حیثیت سے دیکھے جائیں گے۔

ہمیں اس دین کی صحت پر کامل یقین اور بھروسہ نہیں رہا اس لیے ہم میں سے کئی لوگ اس کی تراش خراش کرنے میں مصروفِ عمل ہیں تاکہ اسے مغربی تہذیب و تمدن کی صورت میں ڈھالا جا سکے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو انہوں نے اس مقدس ذات کی تصریحات کو بے وزن بنانے کی مذموم کوششیں کی ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اس دین کی تبلیغ و اشاعت اور اس کے عملی نفاذ کے لیے مبعوث کیا تھا۔ یہ تصریحات اس دین کے اندر بگاڑ پیدا کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اس رکاوٹ کے دُور ہو جانے کے بعد اب ہر قسم کی تبدیلی کے دروازے کھل گئے ہیں۔ چنانچہ وہ دین جو اپنے دائرہ میں کسی غیر اسلامی عنصر کے ساتھ مصالحت تو درکنار نہیں کر سکتا اُس کا حلیہ اب اس حد تک بگاڑا جا چکا ہے کہ اُس کے اندر روحانیت کا کوئی جوہر اب باقی نہیں رہا۔ حشر و نشر، جزا و سزا، اللہ کی بندگی اور رسول کی اطاعت، فرشتے اور تقدیر، جنت اور دوزخ ان میں سے کئی ایک کا یا تو کھلے بندوں انکار کیا گیا ہے یا ان کی ایسی تعبیریں کی گئی ہیں جن سے ان کا حقیقی مقصد ہی فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔

عملی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو صورتِ حال اس سے بھی زیادہ مایوس کن ہے۔ اللہ کا خوف لوگوں کے دلوں سے بالکل مٹ چکا ہے۔ احساسِ جوابدہی کے چہرے پر (باقی صفحہ ۶۲ پر)